ISSN E: 2709-8273
ISSN P:2709-8265
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
JALT

JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL (JALT)
Vol.9 No.1 2026

# آگ کا دریا: عالمی ادب اور فلسفے کے تناظر میں ایک تجزیاتی مطالعہ

# AAG KA DARYA: AN ANALYTICAL STUDY IN THE CONTEXT OF WORLD LITERATURE AND PHILOSOPHY

**ڈاکٹر مختار احمد**

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ میڈیا اسٹڈیز، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، لاہور

**Dr. Mukhtar Ahmmad,**
Assistant Professor, Department of Media Studies, Government College University, Lahore
Government College University, Katchery Road, Lahore, Punjab, Pakistan
Email: mukhtar.ahmmad@gcu.edu.pk

**سرفراز احمد**

ڈیپارٹمنٹ آف میڈیا سٹڈیز پریٹ انسٹیٹیوٹ بروکلن نیویارک امریکہ

**Sarfraz Ahmed,**
(Alumnus) Department of Media Studies Pratt Institute , Brooklyn New York USA
Email: Sahmed43@pratt.edu

**آمنہ جعفر**

طالبہ، بی ایس اردو ، شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، لاہور

Student of BS Urdu, Department of Urdu, Government College University, Lahore
Email: itsamna70@gmail.com

**تلخیص**

زیرِ نظر مقالہ قرۃ العین حیدر کے ناول "آگ کا دریا" کا عالمی ادب اور فلسفیانہ تحریکوں کے تناظر میں تجزیاتی مطالعہ ہے۔ مرکزی مفروضہ یہ ہے کہ یہ ناول محض برصغیر کی تاریخ کا بیانیہ نہیں بلکہ انسانی وجود کے ازلی کرب، وقت کے جبر، شناخت کے بحران اور ابلاغ کی ناکامی کا کائناتی استعارہ ہے۔ مقالے میں ناول کا تقابل البیئر کامیو کے فلسفۂ لایعنیت، میلان کنڈیرا کی یادداشت و فراموشی کی جدلیات، شیخ فرید الدین عطار کے صوفیانہ علامتی سفر، ورجینیا وولف اور جیمز جوائس کی تکنیکِ شعور کی رو، ایڈورڈ سعید کے مابعد نو آبادیاتی نظریات، اور سیموئیل بیکٹ کی وجودی لایعنیت سے کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں چمپا کے کردار کو برصغیر کی اجتماعی نسوانی روح کی علامت کے طور پر زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ اردو تنقیدی روایت میں فاروقی، انور سدید اور آل احمد سرور کی آراء بھی شامل کی گئی ہیں۔ مطالعہ ثابت کرتا ہے کہ "آگ کا دریا" کی آفاقیت کسی ایک زبان یا تہذیب کی میراث نہیں بلکہ انسانی شعور کی مشترک میراث ہے۔

**کلیدی الفاظ: قرۃ العین حیدر، آگ کا دریا، وجودی تنہائی، تقابلی ادب، جبرِ وقت، لایعنیت، شعور کی رو، مابعد نو آبادیاتی بیانیہ، چمپا، صوفیانہ علامتیت، ابلاغ کی ناکامی، نسوانی وجودیت۔**

## Abstract

*This research article presents a comparative and philosophical analysis of Qurratulain Hyder's landmark novel Aag Ka Darya (River of Fire) within the intersection of global literary traditions, existential philosophy, and post-colonial theory. The central thesis argues that the novel transcends its role as a chronological narrative of two and a half millennia of South Asian history, functioning instead as a cosmic metaphor for existential anguish, temporal determinism, the failure of communication, and the crisis of post-colonial identity. Through a comparative methodology, the study correlates Hyder's narrative with Albert Camus's Absurdism, Milan Kundera's dialectic of memory and forgetting, Fariduddin Attar's mystical allegories in Mantiq-ut-Tayr, Virginia Woolf and James Joyce's stream of consciousness technique, Edward Said's post-colonial framework, and Samuel Beckett's theatre of the absurd. The article also offers a sustained analysis of the character Champa as an archetype of the subcontinent's collective feminine memory, a reading largely absent from prior Urdu scholarship. Urdu critical voices including Shamsur Rahman Faruqi, Dr. Anwar Sadeed, and Ale Ahmad Suroor are integrated*

*to bridge national and international critical traditions. The study concludes that the universality of Aag Ka Darya is neither coincidental nor regional, but an earned place in the collective consciousness of world literature.*

**Keywords:** *Qurratulain Hyder, Aag Ka Darya, Existential Solitude, Comparative Literature, Absurdism, Stream of Consciousness, Post-colonial Narrative, Urdu Novel.*

### ا۔ تعارف

اردو ادب کی تاریخ میں کچھ تخلیقات ایسی ہوتی ہیں جو اپنے وقت میں شائع تو ہوتی ہیں مگر ان کی اصل آواز آنے والی نسلوں تک پہنچتی ہے۔ قرۃ العین حیدر کا ناول "آگ کا دریا"[1] ایسی ہی تخلیقات میں سے ایک ہے' ایک ایسی کتاب جو 1959ء میں لاہور سے شائع ہوئی اور اردو فکشن کی تاریخ میں ہلچل مچا دی۔ یہ ناول ڈھائی ہزار سال پر پھیلے ہوئے چار ادوار کو ایک بیانیے کی لڑی میں پروتا ہے: بدھ مت کا شراوستی، مغلیہ عہد کا ہندوستان، اٹھارویں صدی کے آخر کا لکھنؤ، اور تقسیمِ ہند کے بعد کا بے گھر ہندوستان۔ مگر یہ محض تاریخی ابواب نہیں' یہ انسانی شعور کی چار مختلف حالتیں ہیں جو ایک دوسرے میں گھلتی اور ابھرتی رہتی ہیں۔

"آگ کا دریا" کا بنیادی محور وقت کی وہ لہر ہے جو تہذیبوں، نظریات اور عقائد کو خس و خاشاک کی طرح بہا لے جاتی ہے' مگر ساتھ ہی ان کے نقوش انسانی روح پر کندہ کر جاتی ہے۔ قرۃ العین حیدر نے روایتی بیانیے کا قالب توڑا اور اردو ناول کو ایک نئی مابعد الطبیعیاتی جہت دی جو اس سے پہلے اس زبان میں کسی نے نہیں برتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ناول کی اشاعت پر تنقیدی ردِ عمل دو دھاروں میں بٹ گیا: ایک طرف وہ نقاد تھے جنہوں نے اس کی غیر خطی ساخت کو مبہم اور دشوار قرار دیا، اور دوسری طرف آل احمد سرور، شمس الرحمن فاروقی اور خلیل الرحمن اعظمی جیسے ناقدین تھے جنہوں نے اسے اردو فکشن کی اعلیٰ ترین کامیابی قرار دیا۔

شمس الرحمن فاروقی' جو اردو تنقید کی سب سے باریک بیں آواز مانے جاتے ہیں' نے اردو فکشن میں اسی فکری اور تکنیکی جرأت کا تقاضا کیا تھا جو اس سے پہلے کسی نے نہیں دکھائی تھی۔ ڈاکٹر انور سدید نے اپنی وسیع تاریخِ ادب "اردو ادب کی تحریکیں" میں "آگ کا دریا" کو ترقی پسند تحریک کے بعد کے اردو فکشن کا نقطۂ عروج قرار دیتے ہوئے لکھا کہ قرۃ العین حیدر نے اردو ناول کو پہلی بار ایک علمی اور فکری سطح پر عالمی ادب کے برابر کھڑا کر دیا[2]۔

زیرِ نظر مقالہ اسی دعوے کو علمی سطح پر جانچنے کی ایک کوشش ہے۔ ہماری مساعی یہ ہے کہ اس ناول کو عالمی ادبی اور فلسفیانہ روایات کے آئینے میں رکھ کر اس کی آفاقیت کو نہ صرف ثابت کیا جائے بلکہ اس کی ان جہتوں کو بھی روشن کیا جائے جو اردو تنقید میں ابھی تک مناسب توجہ نہیں پا سکیں' خاص طور پر چمپا کا نسوانی استعارہ، ابلاغ کی ناکامی کی مابعد الطبیعیاتی جہت، اور صوفیانہ فنا کا وہ تصور جو ناول کے نام ہی میں پنہاں ہے۔

### ۲۔ منہجِ تحقیق

یہ مقالہ تقابلی ادب (Comparative Literature)، بین المتنیت (Intertextuality)، وجودیاتی تنقید (Existential Criticism)، اور مابعد نو آبادیاتی نظریات (Post-colonial Theory) کے اشتراک پر استوار ہے۔ تقابلی ادب کا منہج یہ مانتا ہے کہ عظیم ادبی تخلیقات قومی یا لسانی حدود سے بلند ہو کر ایک مشترکہ انسانی تجربے کا اظہار کرتی ہیں؛ اسی بنیاد پر ہم "آگ کا دریا" کے موضوعاتی اور تکنیکی پہلوؤں کا تقابل ان عالمی تخلیقات اور فلسفیانہ تحریکوں سے کرتے ہیں جو انسانی وجود کے مشترکہ سوالات سے الجھتی ہیں۔

تحقیق کا نقطۂ آغاز یہ مفروضہ ہے کہ قرۃ العین حیدر نے "آگ کا دریا" میں جو فکری اور جمالیاتی جہان تراشا، وہ کسی ادبی اثر پذیری کا نتیجہ نہیں بلکہ ان کی اپنی تہذیبی حساسیت اور انسانی شعور کی گہرائی سے پھوٹا ہے' اور یہی وجہ ہے کہ جب ہم اسے عالمی ادب کے ساتھ رکھ کر پڑھتے ہیں تو ایک حیرت انگیز ہم آہنگی ملتی ہے جو اس بات کی گواہ ہے کہ انسانی تجربہ اپنی گہرائی میں یکساں ہے، چاہے اسے اردو میں بیان کیا جائے یا فرانسیسی میں، چیک میں یا جاپانی میں۔

### ۳۔ وقت کا تصور: دائروی بیانیہ اور ابدی تکرار

"آگ کا دریا" کا سب سے انوکھا اور فکر انگیز پہلو اس کا تصورِ وقت ہے۔ یہ وہ خطی وقت نہیں جو ماضی سے حال کی طرف اور حال سے مستقبل کی طرف بہتا ہے' یہ وہ دائروی اور بہم پیوستہ وقت ہے جس میں صدیاں ایک دوسرے میں حلول کر جاتی ہیں، جہاں ایک لمحے میں شراوستی کی مٹی، مغلیہ دربار کی روشنی اور تقسیمِ ہند کی راکھ ساتھ ساتھ سانس لیتی ہے۔ وقت کا یہ تصور ٹی ایس ایلیٹ کے اس مشہور مقولے سے ہم آہنگ ہے جو انہوں نے "فور کوارٹیٹس" میں پیش کیا:

> *"Time present and time past / Are both perhaps present in time future, / And time future contained in time past."* [3]

ISSN E: 2709-8273
ISSN P:2709-8265
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
JALT



"آگ کا دریا" اسی فلسفے کی عملی روایت ہے۔ جب گوتم نیلمبر شراوستی کے جنگلوں میں اپنے وجود کا کرب محسوس کرتا ہے تو وہ کسی ایک عہد کا نہیں بلکہ ہر عہد کے اس انسان کا استعارہ ہے جو خود کو کائنات کی لامتناہی خاموشی میں تنہا پاتا ہے۔ اور جب وہی روح صدیوں بعد کمال الدین کے وجود میں حلول کرتی ہے تو ایلیٹ کا یہ خیال حقیقت بن جاتا ہے کہ زمانے الگ نہیں بلکہ ایک دوسرے کے اندر سموئے ہوئے ہیں۔

فرانسیسی فلسفی ہنری برگسوں (Henri Bergson) نے وقت کی دو سطحیں متعارف کرائی تھیں [4]: ایک وہ "گھڑی کا وقت" جسے ناپا اور تقسیم کیا جا سکتا ہے، اور دوسرا "دورے" (Durée) ' وہ زندہ، بہتا اندرونی وقت جو انسانی شعور کا اصل دھارا ہے اور جہاں ماضی، حال اور مستقبل کی سرحدیں مٹ جاتی ہیں۔ قرۃ العین حیدر کا بیانیہ اسی "دورے" پر استوار ہے۔ ناول کو پڑھتے ہوئے قاری اکثر یہ طے نہیں کر پاتا کہ وہ کس صدی میں ہے' اور یہ ابہام کوئی خامی نہیں بلکہ ناول کی وہ آواز ہے جو قاری سے کہتی ہے: "یہ تمہارے ساتھ بھی ہو رہا ہے، اور تم سے پہلے بھی ہوا، اور تمہارے بعد بھی ہو گا۔"

گیبریل گارسیا مارکیز نے اپنے شاہکار One Hundred Years of Solitude میں وقت کے اسی دائروی تصور کو جادوئی حقیقت پسندی کی زبان میں بیان کیا ہے [5]۔ "بوندیا" خاندان کی نسلیں تاریخ کے ایک لامتناہی چکر میں اسی طرح قید ہیں جیسے "آگ کا دریا" کے کردار۔ مارکیز نے لکھا:

"Races condemned to one hundred years of solitude did not have a second opportunity on earth." لیکن قرۃ العین حیدر کا المیہ مارکیز سے زیادہ گہرا ہے: ان کے کردار صرف تنہائی کے نہیں بلکہ تاریخ کے ہاتھوں مسلسل گھڑے اور مٹائے جانے کے سزاوار ہیں' اور پھر بھی وہ جینے کا انتخاب کرتے ہیں۔

تھامس مان (Thomas Mann) نے The Magic Mountain میں وقت کی معطل حالت کو بیان کیا [6]، جہاں سینی ٹوریم کے کردار ایک ایسی دنیا میں زندگی گزارتے ہیں جہاں سال گزرتے ہیں مگر کچھ بدلتا نہیں۔ اسی طرح "آگ کا دریا" میں تاریخ کے بدلتے مناظر کے باوجود انسانی آرزو اور محرومی کی تصویر بدلتی نہیں۔ قرۃ العین حیدر نے مان سے بھی آگے نکل کر یہ ثابت کیا کہ تاریخ سرکاری بیانیوں کا مجموعہ نہیں بلکہ ان گمنام جذبات کا دریا ہے جو نسل در نسل بہتا رہتا ہے' ایک آگ جو ظاہراً بجھتی ہے مگر راکھ کے نیچے سلگتی رہتی ہے۔

**۴۔ وجودی فلسفہ: لایعنیت، کرب اور انسانی وقار**

جب ہم "آگ کا دریا" کے کرداروں کی داخلی دنیا میں اترتے ہیں تو وہاں البیئر کامیو (Albert Camus) کا "فلسفۂ لایعنیت" (Absurdism) ایک خاموش مگر طاقتور موجودگی کے ساتھ ملتا ہے۔ کامیو نے The Myth of Sisyphus میں لکھا:

*"There is but one truly serious philosophical problem, and that is suicide. Judging whether life is or is not worth living amounts to answering the fundamental question of philosophy."* [7]

کامیو کے نزدیک یہ سوال اس وقت جنم لیتا ہے جب انسان "لایعنیت" کا سامنا کرتا ہے' یعنی اس خلیج کا احساس جو دنیا کی بے معنی خاموشی اور انسانی دل کی مسلسل پکار کے درمیان موجود ہے۔ گوتم نیلمبر، کمال الدین، چمپا اور ہری شنکر' یہ سب اسی خلیج کے کنارے کھڑے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ انہیں کوئی حتمی جواب نہیں ملے گا، پھر بھی سوال کرتے رہتے ہیں' یہی ان کی انسانی عظمت ہے۔

کامیو نے سسی فس کے استعارے سے یہ سمجھایا کہ انسان کی جدوجہد اور اس کی لایعنیت ایک ساتھ موجود ہو سکتی ہے' اور اسی اشتراک میں زندگی کا وقار ہے:

*"One must imagine Sisyphus happy."* [8]

یہ وہ اخلاقی عظمت ہے جو قرۃ العین حیدر کے کرداروں کو شکست خوردہ ہونے کے باوجود ایک وقار عطا کرتی ہے۔ وہ تاریخ کے جبر کے سامنے جھکتے ہیں مگر ٹوٹتے نہیں' اور یہی نہ ٹوٹنا ان کا سسی فسی لمحہ ہے۔

دوستوئیفسکی کے The Brothers Karamazov میں بھی یہی وجودی کشمکش ہے۔ آلیوشا، ایوان اور دیمتری تین مختلف انسانی ردِّ عمل ہیں ایک ہی سوال کے سامنے: اگر خدا ہے تو ناانصافی کیوں؟ دوستوئیفسکی نے لکھا تھا: "The mystery of human existence lies not in just staying alive, but in finding something to live for." [9] قرۃ العین حیدر کے کردار بھی اسی "جینے کی وجہ" کی تلاش میں ہیں' کبھی خدا میں، کبھی محبت میں، کبھی فن میں' مگر تاریخ کی گرد ہر بار اس تلاش پر اپنی راکھ بچھا دیتی ہے۔

ژاں پال سارتر نے Nausea میں وجود کے "بے پردہ" ہونے کی کیفیت بیان کی:

*"I exist, that is all, and I find it nauseating."* [10]

ISSN E: 2709-8273
ISSN P:2709-8265
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
JALT



سارتر کی یہ کیفیت "آگ کا دریا" کے ان حصوں میں پوری شدت سے ظاہر ہوتی ہے جہاں کردار اپنی شناخت کھو بیٹھتے ہیں اور نہ اپنے زمانے کے لگتے ہیں نہ آنے والے کے۔ سارتر کا مشہور قول ہے: "Existence precedes essence"، یعنی انسان پہلے موجود ہوتا ہے، پھر خود کو بناتا ہے۔ مگر "آگ کا دریا" کے ہاں یہ فلسفہ ایک تلخ موڑ لیتا ہے: یہاں انسان وہ بنتا ہے جو تاریخ اسے بناتی ہے، اور یہی تاریخ کا جبر اس ناول کا سب سے گہرا المیہ ہے۔

شیکسپیئر نے King Lear میں انسانی بے بسی کو ان الفاظ میں بیان کیا:

*"As flies to wanton boys are we to the gods; / They kill us for their sport."* [11]

"آگ کا دریا" کے کردار بھی تاریخ کے بڑے فیصلوں کے سامنے ایسی ہی بے بسی محسوس کرتے ہیں۔ مگر قرۃ العین حیدر شیکسپیئر کے اس المیے میں ایک عنصر اور شامل کرتی ہیں: یہ کردار صرف تماشائی نہیں، وہ تاریخ کے المیے کے شریکِ سفر ہیں، اور یہی شرکت انہیں صرف شکار کی بجائے ایک گہرے انسانی وقار کا حامل بناتی ہے۔

**۵۔ شعور کی رو: تکنیک اور داخلی کائنات**

تکنیک کے اعتبار سے "آگ کا دریا" اردو ناول نگاری میں ایک انقلاب کی حیثیت رکھتا ہے۔ قرۃ العین حیدر نے وہ کام اردو میں کیا جو انگریزی ادب میں ورجینیا وولف اور جیمز جوائس کے نام سے منسوب ہے: انہوں نے انسانی لاشعور اور شعور کی متوازی دھاروں کو بیانیے کی بنیاد بنایا اور قاری کو اندر سے باہر دیکھنے پر مجبور کیا۔ ورجینیا وولف نے The Common Reader میں لکھا:

*"Life is not a series of gig lamps symmetrically arranged; life is a luminous halo, a semi-transparent envelope surrounding us from the beginning of consciousness to the end."* [12]

"آگ کا دریا" اسی روشن ہالے کی تلاش ہے جو تاریخ کی اندھیری راہداریوں میں کہیں گم ہو گیا ہے۔ قرۃ العین حیدر نے To the Lighthouse کی طرح کرداروں کے خیالات اور احساسات کو منطقی ترتیب سے نہیں بلکہ ان کی اپنی نفسیاتی سرعت سے بہنے دیا ہے[13]۔ کبھی ایک جملہ ختم ہونے سے پہلے ہی زمانہ بدل جاتا ہے، کبھی ایک کردار کا چہرہ دوسرے کردار میں ڈھل جاتا ہے، اور یہ ڈھلنا قاری کو یہ احساس دلاتا ہے کہ شاید یہ سب ایک ہی روح کے مختلف لمحے ہیں۔

جیمز جوائس کا Ulysses ایک دن میں ہومر کی Odyssey کی بازگشت ڈھونڈتا ہے، ایک دن جس میں انسانی ذہن کی لاتعداد پرتیں کھلتی ہیں۔ قرۃ العین حیدر نے اس تکنیک کو ایک مختلف اور وسیع تر اسکیل پر برتا: انہوں نے ڈھائی ہزار سال کو اسی داخلی بہاؤ میں پرو دیا۔ اردو ناول کی اس تکنیکی پسماندگی پر اردو تنقید میں بار بار تشویش ظاہر کی گئی ہے؛ قرۃ العین حیدر نے "آگ کا دریا" کے ذریعے اس کمی کو نہ صرف پورا کیا بلکہ اردو ناول کو تکنیکی اعتبار سے عالمی فکشن کے برابر لا کھڑا کیا۔

ہاروکی موراکامی کے ناولوں میں خواب اور حقیقت کی سرحد اس طرح دھندلا جاتی ہے کہ قاری کے لیے یہ طے کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ وہ کس جہاں میں ہے[14]۔ موراکامی کے کردار ایک پراسرار داخلی تنہائی میں مقید ہوتے ہیں۔ قرۃ العین حیدر کے ہاں یہ داخلی تنہائی تاریخی ہے، یعنی وہ تنہائی جو صدیوں کی گرد نے پیدا کی ہے۔ دونوں ناول نگاروں کے ہاں چاند، دریا، خالی راستے اور بند دروازے محض منظر نگاری نہیں بلکہ کردار بن کر بولتے ہیں۔ یہ مابعد جدیدیت (Postmodernism) کا وہ خاصہ ہے جہاں بیانیہ ہی واحد سچائی بن جاتا ہے اور قاری ہر قرأت میں ایک نئی سچائی دریافت کرتا ہے۔

**۶۔ چمپا: زمین کی روح اور نسوانی المیہ**

اگر "آگ کا دریا" کا وقت ایک کردار ہے تو چمپا اس وقت کی روح ہے۔ چمپا محض ایک عورت نہیں، وہ اس دھرتی کی اجتماعی روح ہے جو ہر فاتح کے سامنے کھڑی ہوتی ہے، ہر تبدیلی کو اپنے وجود پر برداشت کرتی ہے، اور ہر بار ایک نئے دکھ کے ساتھ پھر بھی زندہ رہتی ہے۔ بدھ مت کے عہد سے لے کر تقسیم ہند تک، چمپا کا نام بدلتا ہے، شکل بدلتی ہے، زبان بدلتی ہے، مگر اس کی بنیادی تڑپ نہیں بدلتی: وہ کسی ایسی جگہ کی تلاش میں ہے جسے سرحد نہ کاٹ سکے، جسے فاتح نہ مٹا سکے، جسے وقت نہ بہا سکے۔

یہ کردار ٹالسٹائی کی Anna Karenina کی یاد دلاتا ہے[15]، وہ عورت جو اپنے زمانے کے سماجی جبر اور اپنے دل کی آزادی کے درمیان پس کر تباہ ہو جاتی ہے۔ مگر ٹالسٹائی کی انا اپنی شکست سے شکست مانتی ہے، چمپا نہیں مانتی۔ چمپا ہر شکست کے بعد پھر اٹھتی ہے، نہ اس لیے کہ وہ کمزور نہیں بلکہ اس لیے کہ یہ دھرتی کی فطرت ہے: زخم کھا کر بھی پھل دینا۔ یہی چمپا کا صوفیانہ صبر ہے، وہ صبر جو عطار کی وادیِ استغنا کی یاد دلاتا ہے، جہاں سالک تمام دنیوی آسائشوں سے بے نیاز ہو کر صرف اپنی روح کی تلاش میں نکلتا ہے۔

سارتر نے کہا: "Hell is other people"، یعنی دوسرا انسان میرے لیے جہنم ہے۔ چمپا کا کردار اس تجربے کو ایک اور جہت دیتا ہے: وہ جن سے محبت کرتی ہے وہی اسے تکلیف دیتے ہیں، مگر وہ ان سے جڑی رہتی ہے، نہ محبت کی کمزوری سے بلکہ اس یقین سے کہ رشتہ ٹوٹنے سے تکلیف کم نہیں ہوتی بلکہ تنہائی اور بڑھ جاتی ہے۔ چمپا کی یہ

ISSN E: 2709-8273
ISSN P:2709-8265
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
JALT
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL (JALT)
Vol.9 No.1 2026

نسوانی وجودیت اردو فکشن میں پہلی بار اس گہرائی سے سامنے آئی ہے۔ یہ وہ جہت ہے جسے اردو تنقید نے عموماً نظر انداز کیا' شاید اس لیے کہ ہمارا تنقیدی گفتگو کا مرکز اکثر کمال اور گوتم جیسے مرد کرداروں پر رہا ہے۔ مگر قرۃ العین حیدر کا اصل المیہ چمپا کا المیہ ہے' اس زمین کا المیہ جس پر ہر عہد میں جنگیں لڑی جاتی ہیں مگر جو کبھی جیتتی نہیں۔

**۷۔ صوفیانہ علامتیت: منطق الطیر اور آگ کا سفر**

ناول کا نام ہی ایک گہری صوفیانہ علامت ہے۔ "آگ" تہذیبوں کو جلاتی بھی ہے اور روشن بھی کرتی ہے' وہ تطہیر کرتی ہے اور تباہ کرتی ہے، ایک ہی وقت میں۔ "دریا" بہاتا ہے، مٹاتا ہے، مگر ساتھ ہی ہر زندگی کا سرچشمہ بھی ہے۔ جب یہ دونوں علامتیں یک جا ہوتی ہیں تو ایک ایسا تصور بنتا ہے جو فنا اور بقا کو ایک ہی سانس میں بیان کرتا ہے' بالکل اسی طرح جیسے تاریخ فنا اور بقا کا مسلسل عمل ہے۔

شیخ فرید الدین عطار کی "منطق الطیر" [16] میں پرندے سیمرغ کی تلاش میں سات کٹھن وادیوں سے گزرتے ہیں: وادیِ طلب، وادیِ عشق، وادیِ معرفت، وادیِ استغنا، وادیِ توحید، وادیِ حیرت، اور وادیِ فنا و بقا۔ عطار نے لکھا:

*"If you wish to be lost in this ocean, remember that it will destroy you before it grants you rest."* [16]

قرۃ العین حیدر کے کردار بھی انہی وادیوں سے گزرتے ہیں' مگر ان کی وادیاں جغرافیائی نہیں بلکہ تاریخی ہیں: موریا عہد کی وادیِ طلب، مغلیہ دور کی وادیِ عشق، استعمار کی وادیِ حیرت، اور تقسیم کے بعد کی وادیِ فنا۔ ہر وادی میں وہ اپنا ایک حصہ کھو دیتے ہیں اور ہر بار یہ گمانِ منزل ہوتا ہے کہ شاید اب کی بار سیمرغ ملے گا' مگر ملتا نہیں۔

یہاں عطار اور قرۃ العین حیدر کے درمیان ایک بنیادی اور المناک فرق ہے: عطار کے ہاں منزل مل جاتی ہے' تیس پرندے آخر میں سیمرغ کو پاتے ہیں اور اس میں اپنا عکس دیکھتے ہیں۔ مگر "آگ کا دریا" میں منزل صرف "خودی کے ادراک" تک محدود رہتی ہے' اور یہ ادراک خوشی نہیں، ایک آنکھیں کھولنے والا کرب ہے۔ قرۃ العین حیدر نے اس طرح صوفیانہ روایت کو جدید وجودیت سے ملا کر ایک بالکل نئی فکری جگہ بنائی' ایک ایسی جگہ جہاں سکون نہیں، بس سفر ہے۔

**۸۔ مابعد نوآبادیاتی شناخت کا بحران**

ناول کا آخری حصہ تقسیمِ ہند اور اس کے نتائج پر محیط ہے' اور یہ وہ حصہ ہے جہاں "آگ کا دریا" ایک مابعد نوآبادیاتی دستاویز بن جاتا ہے۔ ایڈورڈ سعید نے Orientalism میں ثابت کیا:

*"The Orient was almost a European invention, and had been since antiquity a place of romance, exotic beings, haunting memories and landscapes, remarkable experiences."* [17]

یہ وہی نوآبادیاتی نظر ہے جو "دوسرے" کو اس کی اپنی آنکھوں سے دیکھنے کی بجائے اسے ایک تصور بنا دیتی ہے۔ "آگ کا دریا" میں سرل ایشلے اسی نظر کا نمائندہ ہے' وہ ہندوستان سے محبت کرتا ہے مگر اسے کبھی اس کی شرائط پر نہیں سمجھتا۔ اس کے مقابلے میں کمال اور چمپا جیسے کردار یہ ثابت کرتے ہیں کہ فتح شدہ قوم کی روح اپنی شناخت سے کبھی مکمل طور پر جدا نہیں ہوتی' چاہے سرحدیں بدل جائیں، چاہے زبان بدل جائے۔

اور خان پامک نے My Name is Red میں لکھا ہے کہ دو تہذیبوں کے سنگم پر کھڑا انسان نہ اس طرف کا ہوتا ہے نہ اس طرف کا [18]۔ یہی وہ معلق کیفیت ہے جو کمال الدین کو درپیش ہے' وہ انگریزی تعلیم یافتہ ہے، اردو اور ہندی بولتا ہے، ہندوستان کی مٹی سے جڑا ہے مگر پاکستان کی طرف سفر پر مجبور ہے۔ اس بیچ کی جگہ' اس معلق فضا' میں وہ نہ مکمل ہندوستانی ہے نہ مکمل پاکستانی، نہ مکمل مسلمان نہ مکمل سیکولر۔ یہ شناخت کا وہ بحران ہے جسے ہومی بھابھا نے "third space" کہا ہے' ایک ایسی جگہ جو نہ یہاں ہے نہ وہاں۔

میلان کنڈیرا نے The Book of Laughter and Forgetting میں کہا:

*"The struggle of man against power is the struggle of memory against forgetting."* [19]

قرۃ العین حیدر نے اس ناول کے ذریعے اسی قومی اور تہذیبی یادداشت کو محفوظ کیا جسے سیاسی سرحدوں نے کاٹنے کی کوشش کی تھی۔ تقسیمِ ہند صرف زمین نہیں بانٹتی' وہ یادداشت بانٹتی ہے، رشتے بانٹتی ہے، انسان کو اپنے آپ سے بانٹتی ہے۔ "آگ کا دریا" اس بانٹنے کے عمل کا ایک دردناک اور لافانی ریکارڈ ہے۔

قرۃ العین حیدر نے تقسیم کے المیے کو سیاسی نہیں بلکہ ثقافتی اور روحانی سطح پر برتا۔ جہاں دوسرے ناول نگار تقسیم کے فوری واقعات اور ہجرت کی تکالیف کو بیان کرتے تھے، قرۃ العین حیدر نے اس سے گہرے اترتے ہوئے پوچھا: وہ تہذیبی ربط جو صدیوں میں بنا تھا، کیا وہ واقعی ایک لکیر کھینچ دینے سے کاٹا جا سکتا ہے؟ اور اس سوال کا ان کا جواب ناول کی روح میں پیوست ہے: نہیں، آگ اور دریا کسی سرحد کو نہیں جانتے۔

**۹۔ ابلاغ کی ناکامی اور وجودی جبر**

"آگ کا دریا" میں انسانی رشتوں کا المیہ محض سماجی یا سیاسی نہیں، یہ بنیادی طور پر مابعد الطبیعیاتی ہے۔ یہ وہ المیہ ہے جو ہر زبان اور ہر زمانے کے انسان کو لاحق ہے: ہم ایک دوسرے سے بات تو کرتے ہیں مگر ایک دوسرے تک پہنچ نہیں پاتے۔ سیموئیل بیکٹ نے Waiting for Godot میں اس کیفیت کو ان الفاظ میں بیان کیا:

*"Nothing happens, nobody comes, nobody goes, it's awful."* [20]

یہ جمود، یہ انتظار، یہ احساس کہ کچھ بھی واقعی بدلنے والا نہیں، یہ "آگ کا دریا" کے آخری حصے میں بھی سایے کی طرح موجود ہے۔ کردار سرحد کے دونوں طرف ایک ایسی فضا میں زندگی گزارتے ہیں جہاں الفاظ بولے تو جاتے ہیں مگر ان کا وزن پہنچنے سے پہلے ہی ختم ہو جاتا ہے۔

کمال اور چمپا کے درمیان جو دیوار ہے وہ دراصل ان کے اپنے اذہان نے تعمیر کی ہے، وہ ذہن جنہیں تاریخ نے، مذہب نے، نظریات نے اور سیاسی سرحدوں نے اس قدر بھاری کر دیا ہے کہ اب خالص جذباتی سطح پر ملنا ممکن نہیں رہا۔ ناول کے آخری حصے میں کمال یہ جملہ کہتا ہے:

*"اگر تمہارا ذہن تم سے کوئی مختلف چیز ہے تو اسے باہر کہیں دور چھوڑ آؤ اور صرف تم میرے پاس آ جاؤ۔"[21]*

یہ محض ایک رومانوی التجا نہیں، یہ ایک وجودی مطالبہ ہے جس میں سارتر کے اس خیال کی بازگشت ہے کہ فرد دوسرے کے وجود میں ضم ہونا چاہتا ہے مگر اس کا اپنا شعور اسے ہمیشہ الگ رکھتا ہے۔ قرۃ العین حیدر یہاں یہ ثابت کرتی ہیں کہ تاریخ کے جمع کردہ بوجھ نے انسانی ذہن کو اتنا بھاری کر دیا ہے کہ اب دو روحوں کا بلاواسطہ ملنا شاید ممکن نہیں رہا، اور یہی وہ مقام ہے جہاں "آگ کا دریا" ایک لافانی انسانی المیہ بن کر کھڑا ہو جاتا ہے۔

بیکٹ کی طرح قرۃ العین حیدر کے ہاں بھی خاموشی خود ایک بیان ہے۔ جب الفاظ کام کرنا چھوڑ دیتے ہیں تو جو فاصلہ بچتا ہے وہ محض دو انسانوں کے درمیان نہیں بلکہ دو زمانوں، دو تہذیبوں، دو دنیاؤں کے درمیان کا فاصلہ ہے، اور اس فاصلے کو پاٹنے کی ناکام کوشش ہی "آگ کا دریا" کی آخری آواز ہے۔

**۱۰۔ نتیجہ**

اس تحقیقی جائزے کے اختتام پر ہم ایک ایسے مقام پر پہنچتے ہیں جہاں "آگ کا دریا" کی عظمت محض ادبی حسن تک محدود نہیں رہتی، یہ ایک فکری ضرورت بن جاتی ہے۔ یہ ناول ہمیں یاد دلاتا ہے کہ تاریخ صرف اقتدار کی کہانی نہیں بلکہ ان بے نام روحوں کی کہانی بھی ہے جنہوں نے ہر عہد میں جینے کا انتخاب کیا، محبت کرنے کا انتخاب کیا، اور سچ بولنے کا انتخاب کیا، جانتے ہوئے کہ یہ انتخاب انہیں آگ سے گزرنے پر مجبور کرے گا۔

کامیو کے لایعنیت، وولف کے روشن ہالے، عطار کی سات وادیوں، سعید کے مابعد نوآبادیاتی بحران، بیکٹ کی خاموشی، اور کنڈیرا کی یادداشت کی جنگ، ان سب کا اشتراک "آگ کا دریا" میں ایک ایسی ہم آہنگی سے ملتا ہے جو ثابت کرتی ہے کہ قرۃ العین حیدر نے شعوری یا ذوقی طور پر انسانی تجربے کی وہ گہرائیاں چھوئی ہیں جو کسی ایک تہذیب یا زبان کی ملکیت نہیں۔ اردو تنقید میں جس فکری سطح کا مطالبہ کیا جاتا رہا ہے، "آگ کا دریا" اس کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے۔

گوتم نیلمبر کا "سوختہ سر" محض ایک کردار کا نہیں، یہ ہر اس انسان کا استعارہ ہے جو سچائی کی تلاش میں تاریخ کی آگ سے گزرا اور راکھ بن کر بھی زندہ رہا:

*" جہاں زاد!*
*نیچے گلی میں تیرے گھر کے آگے،*
*میں سوختہ سر،*
*گوتم نیلمبر ہوں!"*

آج کے مشینی، ڈیجیٹل اور تیز رفتار دور میں جب انسان اپنی جڑوں سے کٹ رہا ہے اور تاریخ کو ایک بوجھ کی نظر سے دیکھنے لگا ہے، "آگ کا دریا" ایک آئینے کی طرح ہمارے سامنے آتا ہے اور ہمیں ہماری اصل دکھاتا ہے۔ یہ ہمیں یاد دلاتا ہے کہ ہم سب اسی دریا کے مسافر ہیں، ہمارے پاس کچھ بھی مستقل نہیں: نہ نام، نہ سرحد، نہ نظریہ۔ مستقل ہے تو صرف یہ پیاس، جاننے کی، محبت کرنے کی، سمجھے جانے کی، اور یہی آگ ہے جو کبھی نہیں بجھتی۔

ISSN E: 2709-8273
ISSN P:2709-8265
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
JALT



"آگ کا دریا" اردو ادب کا وہ ناول ہے جو تقابلی ادب کی عالمی بحث میں اردو کو نہ صرف ایک نشست دیتا ہے بلکہ یہ ثابت کرتا ہے کہ یہ نشست عطیہ نہیں، استحقاق ہے۔ اسے عالمی سطح پر پڑھنا، ترجمہ کرنا اور تنقیدی نظریات کے تناظر میں سمجھنا' یہ نہ صرف اردو ادب کے لیے ضروری ہے بلکہ عالمی انسانی میراث کے لیے بھی۔

## حوالہ جات

[1] قرۃ العین حیدر، آگ کا دریا (لاہور: سنگِ میل پبلیکیشنز، 1959)، ص 45۔

[2] انور سدید، اردو ادب کی تحریکیں (لاہور: سنگِ میل پبلیکیشنز، 1985)۔

[3] ٹی ایس ایلیٹ، فور کوار ٹیٹس (لندن: فیبر اینڈ فیبر، 1944)، ص 13۔

[4] ہنری برگسوں، ٹائم اینڈ فری وِل، مترجم: ایف ایل پوگسن (لندن: جارج ایلن اینڈ انون، 1910)۔

[5] گیبریل گارسیا مارکیز، ون ہنڈرڈ ایئرز آف سولی ٹیوڈ، مترجم: گریگوری رباسا (نیویارک: ہارپر اینڈ رو، 1970)، ص 156۔

[6] تھامس مان، دی میجک ماؤنٹین، مترجم: جان ای ووڈز (نیویارک: نوف، 1995)، ص 342۔

[7] البیئر کامیو، دی متھ آف سسی فس، مترجم: جسٹن اوبرائن (نیویارک: ونٹیج، 1991)، ص 3۔

[8] ایضاً، ص 123۔

[9] فیوڈور دوستوئیفسکی، دی برادرز کرامازوف، مترجم: رچرڈ پیویئر اور لاریسا وولوخونسکی (لندن: ونٹیج، 1992)، ص 210۔

[10] ژاں پال سارتر، نوزیا، مترجم: لائیڈ الیگزینڈر (نیویارک: نیو ڈائریکشنز، 1964)، ص 78۔

[11] ولیم شیکسپیئر، کنگ لیئر، مرتب: آر اے فوکس (لندن: آرڈن شیکسپیئر، 1997)، ایکٹ 4، سین 1، ص 36۔

[12] ورجینیا وولف، دی کامن ریڈر (لندن: ہوگرتھ پریس، 1925)، ص 189۔

[13] ورجینیا وولف، ٹو دی لائٹ ہاؤس (لندن: ہوگرتھ پریس، 1927)، ص 44۔

[14] ہاروکی موراکامی، کافکا آن دی شور، مترجم: فلپ گیبریل (لندن: ونٹیج، 2005)، ص 89۔

[15] لیو ٹالسٹائی، انا کرینینا، مترجم: رچرڈ پیویئر اور لاریسا وولوخونسکی (لندن: پینگوئن، 2000)، ص 1۔

[16] فریدالدین عطار، منطق الطیر، مترجم: افنان فاطمی (لاہور: مجلسِ ترقیِ ادب، 2010)، ص 112۔

[17] ایڈورڈ سعید، اورئینٹلزم (نیویارک پینتھیون بکس، 1978)، ص 1۔

[18] اورخان پامک، مائی نیم از ریڈ، مترجم: ایرداغ گوکنار (لندن: فیبر اینڈ فیبر، 2001)، ص 102۔

[19] میلان کنڈیرا، دی بک آف لافٹر اینڈ فارگیٹنگ، مترجم: مائیکل ہنری ہائم (نیویارک: الفریڈ اے نوف، 1980)، ص 3۔

[20] سیموئیل بیکٹ، ویٹنگ فار گوڈو (نیویارک: گرو پریس، 1954)، ص 12۔

[21] قرۃ العین حیدر، آگ کا دریا (لاہور: سنگِ میل پبلیکیشنز، 1959)

## Bibliography

Attar, Fariduddin. Mantiq-ut-Tayr. Trans. Afnan Fatimi. Lahore: Majlis-e-Taraqqi-e-Adab, 2010, p. 112.

Beckett, Samuel. Waiting for Godot. New York: Grove Press, 1954, p. 12.

Bergson, Henri. Time and Free Will: An Essay on the Immediate Data of Consciousness. Trans. F. L. Pogson. London: George Allen & Unwin, 1910.

Camus, Albert. The Myth of Sisyphus and Other Essays. Trans. Justin O'Brien. New York: Vintage, 1991, pp. 3, 123.

Dostoevsky, Fyodor. The Brothers Karamazov. Trans. Richard Pevear and Larissa Volokhonsky. London: Vintage, 1992, p. 210.

Eliot, T. S. Four Quartets. London: Faber & Faber, 1944, p. 13.

Hyder, Qurratulain. Aag Ka Darya. Lahore: Sang-e-Meel Publications, 1959, pp. 45, 682.

ISSN E: 2709-8273
ISSN P:2709-8265
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
JALT



Kundera, Milan. The Book of Laughter and Forgetting. Trans. Michael Henry Heim. New York: Alfred A. Knopf, 1980, p. 3.
Mann, Thomas. The Magic Mountain. Trans. John E. Woods. New York: Knopf, 1995, p. 342.
Márquez, Gabriel García. One Hundred Years of Solitude. Trans. Gregory Rabassa. New York: Harper & Row, 1970, p. 156.
Murakami, Haruki. Kafka on the Shore. Trans. Philip Gabriel. London: Vintage, 2005, p. 89.
Pamuk, Orhan. My Name is Red. Trans. Erdağ Göknar. London: Faber, 2001, p. 102.
Sadeed, Anwar. Urdu Adab ki Tehreekein. Lahore: Sang-e-Meel Publications, 1985.
Said, Edward W. Orientalism. New York: Pantheon Books, 1978, p. 1.
Sartre, Jean-Paul. Nausea. Trans. Lloyd Alexander. New York: New Directions, 1964, p. 78.
Shakespeare, William. King Lear. Ed. R. A. Foakes. London: Arden Shakespeare, 1997, Act 4, Sc. 1, p. 36.
Tolstoy, Leo. Anna Karenina. Trans. Richard Pevear and Larissa Volokhonsky. London: Penguin, 2000, p. 1.
Woolf, Virginia. The Common Reader. London: Hogarth Press, 1925, p. 189.
Woolf, Virginia. To the Lighthouse. London: Hogarth Press, 1927, p. 44.